اوراقِ پارینہ

وزیر اعظم برطانیہ کے نام

وفات سے تین دن پہلے مولانا محمد علی کا تاریخی مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لندن۔ ہائڈ پارک ہوٹل، یکم جنوری ۱۹۳۱ء

جناب والا!

جیسا کہ میں نے کانفرنس کے اجلاس میں کہا تھا، میری صحت اتنی خراب ہے کہ میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے سفر کرنے کے کسی طرح قابل نہ تھا۔ خاص کر جیسا کہ میرے ڈاکٹر آپ کو بتا سکتے ہیں، اور ان تردداتِ کو برداشت کرنے کے بالکل ہی قابل نہ تھا۔ ۱۹ ر دسمبر کو میں بے ہوش ہو گیا، اور ۲۴ گھنٹہ سے زیادہ بے ہوش رہا۔ میری نبض کی رفتار ۱۴۰ حرارت صرف ۹۷ جو اور بھی کم ہو کر ۹۵ رہ گئی تھی۔ اور میرا تنفس ۳۰ تھا۔ اس حالت میں بھی جس کام کے لیے میں یہاں آیا تھا۔ اس کے کرنے کی خواہش میرے اندر اس قدر قوی تھی کہ میں نے لارڈ چانسلر کو ۸ بجے شام کو ناشتہ کی دعوت دی، یعنی شام کے وقت کو صبح کا وقت سمجھا۔ دوسرے دن انھوں نے کرم فرمایا۔ لیکن میرے بھائی نے ان کو صرف دس منٹ کے لیے مجھ سے ملنے کی اجازت دی اور اس مختصر وقت میں بھی نہایت دشواری کے ساتھ اپنے خیالات اُن پر ظاہر کر سکا۔

چونکہ میری یہ خواہش تھی کہ میں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے نمائندوں، اور نیز ہندوستانی نمایندوں (جو میرے خیالات سے کسی حد تک واقف بھی تھے) کو اپنے خیالات سے مطلع کرنے کے لیے ان خیالات کو حیطۂ تحریر میں لے آؤں۔ اسی لیے میں نے آپ سے یہ

درخواست کی تھی کہ آپ مہربانی فرما کر میرے پرانے دوست سر جوفری کاریٹ کہ جس سے میری دوستی چھند واڑہ میں شروع ہوئی تھی، میرے پاس ہوں تاکہ اُن کی موجودگی میں اقلیتوں کے متعلق جن کی کمیٹی کا میں ممبر ہوں، میرے خیالات قلم بند کر لیے جائیں۔

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم سوال کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا بالکل غلط ہے۔ ہندوستان میں بلاشبہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں، اور یقیناً ہم کو اُن کے لیے ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آیندہ حکومت ہند بعض ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی بلکہ وہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ ہوگا۔ تاہم اپنی حکومت کے متعلق اہل ہند کی ذمہ داریوں کے راستے میں ایک مشکل ضرور ہے۔ اور وہ ان اقلیتوں کا سوال نہیں ہے بلکہ ان گہرے اختلافات کا سوال ہے جو ہندو اور مسلمان کے درمیان موجود ہے۔ یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ مجھے تاریخی حالات بے شمار اور اعداد بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں ایک دو باتیں خاص طور پر زور دے کر بیان کر دینا چاہتا ہوں جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہندو مسلمانوں کا سوال اقلیتوں کے سوال سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے اوّل یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان پر آٹھویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے وسط تک کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں حکومت کرتے رہے۔ اسلام اور اتنے عرصہ تک کسی دوسری قوم نے ہندوستان میں حکومت نہیں کی۔ سکھوں کی ایک نسل نے تنہا پنجاب کے صوبہ پر کچھ روز حکومت کی۔ یہ حکومت محض ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں سکھوں کی شجاعت پر حرف رکھوں۔ درانحالیکہ میں پٹھہ کے نظام کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اسی طرح مرہٹوں کی لوٹ مار اور ان کی متحدہ درولبست ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے ہم پلّہ نہیں ہے۔ اس کے بعد خواہ فوجی فتوحات یا سیاسی چالاکیوں کے ذریعہ سے اسلامی حکومت آخرکار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی۔ سوائے بعض ہندوستانی ریاستوں کے جو عہد قدیم سے ہندوؤں کی مخصوص ریاستیں ہیں، اور جو اپنی نسل کا سلسلہ چاند اور سورج سے

بتلاتے ہیں۔ ان ہندو ریاستوں کا تعلق مسلمانوں سے جو بھی رہا ہو، لیکن اس میں تو ذرا شک نہیں کہ ان ریاستوں نے ہمیشہ اسلامی حکومت کے ساتھ گہری وفاداری کے عقائد وابستہ رکھے۔ اور ان کو اپنے معاملات میں ایسی آزادی حاصل رہی جس سے برطانوی اقتدار کے زمانہ میں وہ محروم ہوگئیں۔ ان کے علاوہ بعض ریاستیں وہ ہیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہوئیں، اور برطانوی حکومت نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ بعض ریاستیں، مثلاً حیدر آباد کمپنی سے ابتدائی معاہدوں کے وقت، بجائے خود کمپنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور زیادہ طاقتور تھیں لیکن وہ کمپنی کی وفادار، اتحادی بن گئیں۔ بعض ایسی تھیں جو کمپنی سے چھوٹی تھیں۔ بہر حال اس بحث سے مجھے فی الحال کوئی تعلق نہیں۔

میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ صحیح یا غلط طور پر مسلمانوں نے ہندوستان پر کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ پر آٹھویں صدی سے انیسویں صدی تک اس طرح حکومت کی کہ کسی دوسری قوم نے کبھی نہیں کی۔ اس واقعہ کا نہایت اہم نتیجہ جس سے ہم کو بحث کرنی ہے وہ احساس ہے جو اسلامی حکومت کے اس طویل اور وسیع دور سے پیدا ہوا۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی قوم ایسی ہوگی جو عہد قدیم کے مسلمانوں کے خلاف صحیح یا غلط کوئی شکایت نہ رکھتی ہو، اور فطرت انسانی کا اقتضا جو ہر ملک کی تاریخ میں عیاں بھی ہے کہ بعض ہندوؤں اور بعض دوسری قوموں کے افراد کے دلوں میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی خواہش موجود ہو۔ مگر مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں مثلاً سکھ، مرہٹہ، راجپوت وغیرہ کے خلاف اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا یہی احساس ہے جس سے ہم کو بحث کرنی ضروری ہے اور جس کے متعلق ہمیں آئندہ کے لیے تحفظ کے ذرائع پیدا کرنے ہیں تاکہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کا ایک ایسا دستور العمل بنایا جائے جس میں تمام قومیں محسوس کریں کہ وہ محفوظ، مساوی اور آزاد ہیں۔ دوسرا قابل غور سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اس قسم کی اقلیت نہیں ہیں جس معنی میں کہ جنگ کے بعد یورپ میں یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ "جمعیت اقوام" یورپ کی اقلیتوں کا انتظام کرتی ہے۔ مگر ہمارے ہندوستانی فضلاء اور

پروفیسر "جمعیت اقوام" سے اقلیتوں کے متعلق اصول کا رعاریت لاتے ہیں اور اسی کے طرز عمل اور طریقۂ حکم برداری کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح جینوا میں بیٹھ کر ہندوستان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ خود ہندوستان جینوا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو تنہا ہندوستان میں ۷ کروڑ سے زیادہ ہے بآسانی اس معنے میں اقلیت نہیں کہلائی جا سکتی جس مفہوم میں یہ لفظ جینوا میں استعمال ہوتا ہے، جب کہ ساری دنیا میں یہ قوم ۴۰ کروڑ کے قریب ہے اور اس کا مطمح نظریہ ہے کہ دنیا کی بقیہ اقوام کو اپنے طرز خیال اور اپنے نظریہ کا معتقد بنالے اور جو ایک عدیم المثال اخوّت کی مدعی ہے۔ ایسی قوم کو اقلیت کے نام سے پکارنا محض لغو ہے۔

ان دو خاص نکات کو پیش نظر رکھ کر اب ہم کو چاہیے کہ اصل بحث پر غور کریں۔ گول میز کانفرنس کے ایک سبھائی ممبر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں قوموں کے درمیان وزیر اعظم ثالث بن جائیں۔ اس تحریک میں بلاشبہ وزیر اعظم کی تعریف و توصیف مضمر تھی۔ لیکن ان کی پوزیشن کو اس تجویز نے بہت نازک بنا دیا، اور اس لیے انھوں نے تشکریہ کے ساتھ اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اس تجویز کے اندرونی منشا کو خوب سمجھ لیا ہو گا۔ اسی طرح ہم نے یہ تجویز بھی سنی کہ اس معاملہ کو "جمعیت اقوام" کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ہندوستان کے گندہ لباس کو ساری دنیا کے سامنے دھویا جائے۔ بحالت موجودہ ہم کو تو اس واقعہ نے کافی بد دل کر دیا ہے کہ گول میز کانفرنس کو ہندوستانی فرقہ بندیوں کا "دھوبی تلاؤ" بنا لیا گیا۔ یہ سوال تو درحقیقت ہندوستان ہی میں طے ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے دس برس تک ہر قسم کے گرم و سرد میں گاندھی جی کے ساتھ کام کیا، اور یہ چیز ہم نے بار بار ان کے سامنے پیش کی۔ لیکن ہندوؤں نے اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کے خیال سے کبھی سمجھوتہ نہ ہونے دیا۔ جب ۱۹۲۸ء میں باوجود ہماری پُرزور درخواست کے کانگرس نے ہندو مسلم سمجھوتہ نہ کرایا تو سر تیج بہادر سپرو نے انتہائی کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کا سمجھوتہ ہو جائے اور سر سپیڑو بھی اس کے بہت خواہش مند تھے لیکن ہندو مہاسبھا نے گو کہ شروع میں یہ ظاہر کیا کہ وہ اعتدال پسندوں اور مسلمانوں کی اس خواہش میں

شریک ہے، لیکن بہت سے جلسوں کو ملتوی کراتے کراتے آخر کار بمبئی کی کانفرنس میں حصہ لینے سے بالکل ہی انکار کر دیا، اور ڈاکٹر مونجے نے تو صاف طور پر اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ گول میز کانفرنس سے پہلے سمجھوتہ کی کوشش کرنے کے لیے وہ تیار نہیں۔ کانگرس نے ہندو مہاسبھا کی مقابلت کی اور گول میز کانفرنس میں شرکت ہی سے انکار کر دیا۔ حالانکہ دستور اساسی کے تیار ہونے سے پہلے یہ سمجھوتہ ضروری تھا۔ مہاسبھا کے تین ممبر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لیکن انھوں نے بھی باوجود ہندو مسلمان اعتدال پسندوں کی انتہائی کوششوں کے ایک سمجھوتہ نہیں ہونے دیا ہے۔ مجھے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں نے ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ کی گفتگوؤں میں اور نیز وزیر اعظم سے گفت و شنید میں کتنا وقت ضائع کیا ہے۔ میرے خیال میں خود وزیر اعظم اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مگر اب کہ ضابطہ کی ایک کمیٹی اس غرض کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ سمجھوتہ کی بحث کو صاف طور پر بیان کر دیا جائے۔

سب سے پہلے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور دوستانہ طریقے میں وزیر اعظم کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سوال محض پنجاب یا بنگال کا نہیں ہے جیسا کہ بظاہر وہ سمجھتے ہیں، نہ یہ سوال ہے پنجاب میں ۱۰ کے بجائے ۱۱ کر دینے کا۔ یا اسی قسم کے کسی تغیر کا جیسا کہ وزیر اعظم کا خیال اس وقت معلوم ہوتا تھا، جس وقت وہ چیکرس میں سمجھوتہ اور صلح کی کوشش کر رہے تھے جیسا کہ میں نے عام کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہم اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ہزارہا سال سے تمام نام نہاد ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اب نہیں چاہتے کہ کوئی اکثریت ہندو یا ہندوستانی ایسی ہو جس کو وہ اسی طرح اپنے زیر اقتدار نہ رکھ سکیں جیسا کہ ہزارہا سال تک رکھ چکے ہیں۔ مگر ایک فرق ضرور ہے، وہ میں کہہ دوں۔ سر جان سائمن نے سرویلٹائن چرول کے حوالہ سے برہمنوں کے اقتدار کا ذکر کیا ہے اور وہ ذکر کسی قدر بعد از وقت ہے۔ برہمنوں نے کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ عوام کو تعلیم دی ہے۔ اور یہ خیال غلط ہی سہی، ان کو ضرور تھا کہ ان کے ذریعے سے عاقبت میں لوگوں کو نجات حاصل ہوتی ہے۔ مگر اب جو

اجارہ دار ہے اور چاہتا ہے کہ تمام ہندو قوم کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھے جب کہ وہی قوم اکثریت رکھتی ہے۔ اس فرقہ سے نہ ڈاکٹر مونجے اور نہ راجہ نریندر ناتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ فرقہ بنئے کا فرقہ ہے جو نہ کسی کے نجات عاقبت کو سمجھتا ہے نہ اس دنیا میں کسی قوم کو تعلیم دینے کا خیال رکھتا ہے۔ میں شاید ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہش مند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو جائے یعنی (اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت ہو) وہ اقتدار ختم ہو جائے جو ایک "دکانداروں کی قوم" نے ہماری قسمتوں پر حاصل کر لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے گول میز کانفرنس کے دعوت نامہ کے جواب میں ہز میجسٹی وائسرائے کو لکھا تھا میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی "دکانداروں" کے بجائے خود اپنے ملک میں "دکانداروں" کے ایک ملکی فرقہ کو اپنی قسمتوں پر حاوی کر دیا جائے۔ میرے خیال میں بہت سی سیاسی بے چینی کو مالی امداد ایک حد تک ذاتی اغراض کے لیے بمبئی اور گجرات کے بنیوں سے مل رہی ہے اور گو کہ میں نے ہمیشہ ایک شلنگ چار پنس اور ایک شلنگ چھ پنس کے رخ تبادلہ کا مذاق اڑایا ہے لیکن آج تو سیاسی جنگ ہندوستان کی آزادی کے لیے اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ شرح تبادلہ کے لیے ہے۔ یہ جنگ خواہ کتنی ہی بجا اور حق پر ہو مگر وسیع معنی میں یہ جنگ ہندوستان کی آزادی کی جنگ نہیں ہے۔

اب ہندو مسلم مسئلہ کو لیجیے۔ یہ کسی صوبہ کا سوال نہیں ہے۔ ہر صوبہ میں ہندو مسلمان کے محسوسات ایک دوسرے کے متعلق کم و بیش یکساں ہیں۔ تین نسلیں گذر چکیں جب مسلمانوں کا اقتدار ہندوستان میں ختم ہوا تھا۔ انگریزوں نے یہ اقتدار زیادہ تر مسلمانوں سے حاصل کیا اور کسی حد تک مرہٹوں سے جو آخری زمانہ میں دہلی کے مغلیہ دربار کے سربراہ کار تھے اور نیز کسی حد تک پنجاب کے سکھوں سے جن کو خود انگریزوں نے پنجاب میں حکومت کرنے کی اس لیے اجازت دی کہ انگریز افغانستان سے جنگ کر رہے تھے۔ اب ہندوستان اس مقصد کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا، اور جیسا کہ دس سال پہلے ظاہر ہو چکا ہے مسلمان اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قربانیاں پیش کرتے ہیں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ آج بھی کچھ مسلمان کانگرس میں شریک ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو اس مطالبہ آزادی کی عادت سے مجبور ہو کر جو خود ہم نے دس برس پہلے پیدا کی تھی کام کر رہے ہیں، یا محض جنبش کا اتباع

کر رہے ہیں۔ بہت سے مسلمان نافرمانی قانون کی تحریک سے اسی طرح الگ رہے جس طرح دس برس پہلے ترک موالات کی تحریک سے الگ رہے تھے جب کہ ٹرکی کا معاملہ بھی الجھا ہوا تھا۔ اپنی اہمیت کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کرنے کے بجائے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ جن کا میں نے ذکر کیا، جن میں سے بہت سے گول میز کانفرنس کے نمائندے بنائے گئے ہیں۔ خواہ ہز میجسٹی کی گورنمنٹ، یا حکومت ہند، یا صوبوں کی حکومت نے ان کو نامزد کیا ہو، وہ نہیں ہیں جنھوں نے اپنے اثر سے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا ہو جیسے کہ دس سال پہلے انھوں نے روکا تھا گو کہ یہ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہم ہی تھے جن کو تقریباً ہر صوبہ میں لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں، اور ہماری ہی کوششوں سے بہت سی جگہ مسلمان کانگریس میں شرکت سے باز رکھے جا سکے۔ ہم نے ان کو سمجھا دیا کہ گذشتہ تحریک گو کہ قومی تحریک تھی مگر موجودہ تحریک میں (مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں بات کر رہا ہوں) گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں نے ہندو مہا سبھا کو خوش کرنے کے لیے اپنا سر جھکا دیا ہے۔ اب کہ ہم لوگ یہاں آئے ہیں۔ میں تنہا اپنی پارٹی کا نمایندہ ہوں۔ حالانکہ میں نے اس زمانہ میں جب یہاں آمد سے پہلے میں ہندوستان میں بیمار پڑا ہوا تھا اور نمائندوں کا آخری انتخاب کیا جا رہا تھا۔ ہز ایکسیلینسی وائسرائے سے اس باب میں بہت طویل خط و کتابت کی۔ تنہا میں ہی اپنی پارٹی کا نمایندہ منتخب ہو سکا، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ مجھ ہی سے اور بلاشبہ میرے بھائی سے لاکھوں مسلمان ہمارے واپس جانے کے بعد سوال کریں گے کہ ہم ان کے لیے گول میز سے کیا لائے۔ ہم یہاں سے محض جداگانہ حق انتخاب ان کے لیے یا صرف "ویٹیج" لے کر نہیں جانا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم کو یہ چیزیں نہ ملیں تو میں وزیر اعظم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں بلا تکلف شریک ہوں گے۔ ہم یا دوسرے مسلمان نمایندے کچھ ہی کریں اور کچھ ہی کہیں۔

ہندوستان کی آزادی محض "جداگانہ انتخاب" میں مضمر نہیں گو کہ اس حیثیت سے کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو پیدا کیا۔ میں اس چیز کو ہاتھ سے

دینے والا آخری شخص ہوں گا۔

مجھے عرض کر دینا چاہیے کہ "جداگانہ انتخاب" کا فائدہ کیا ہے۔ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کو اس کا موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کر سکیں۔ ہر عدالت میں فریق مقدمہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کا وکیل مقرر کرے۔ گو کہ کبھی کبھی گورنمنٹ کے خرچ سے بھی وکیل مقرر کیا جاتا ہے۔ مگر فریق مخالف کو کبھی اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ دوسرے فریق کے لیے وکیل منتخب کرے۔ اگر جج آزاد اور منصف مزاج ہو تو ایک معتمد وکیل بالکل کافی ہوتا ہے اور لارڈ مارلے اور منٹو نے ہمارے لیے اسی کا انتظام کیا تھا۔ اس وقت لارڈ مارلے کے ذہن میں یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ کے اصول پر برطانوی حکومت قائم کی جائے اس وقت سرکاری ممبروں کا اجتماع موجود تھا۔ حکومت ہند میں برطانوی اکثریت موجود تھی۔ اور وہ اسی لیے قائم رکھی گئی تھی کہ ہندوستان میں اس بات کو ظاہر کر دے کہ پارلیمنٹ کے قائم کرنے کا کوئی خیال نہیں ہے۔ ہر قوم اپنا معاملہ جج کے سامنے پیش کرتی تھی اور جج فیصلہ کرتا تھا، ہم جج پر کچھ اثر تو ڈال سکتے تھے مگر نہ اس کی رہنمائی کر سکتے تھے نہ اس کو مشورہ دے سکتے تھے اس لیے صرف ایک معتمد وکیل کی ضرورت تھی اور اس کا انتخاب ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے سے کرتے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی، اتفاقیہ طور پر، قصداً نہ سہی، لارڈ منٹو نے نہ صرف موجودہ ضرورت کا انتظام کیا تھا بلکہ آیندہ کے لیے بھی کچھ فکر کی تھی۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب صرف مسلمانوں کی مزید امداد کے لیے بنائے گئے تھے تاکہ جو کمی ہندو اکثریت کے مقابلہ میں رہ جائے اس کو پورا کریں لارڈ مارلے نے مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو ان کے حصہ سے محروم نہیں کیا تھا۔ یہی خطرناک غلطی تھی جو ہمارے ہندوستانیوں کے اصرار پر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کی گئی جب کہ ہم دونوں بھائی چھندواڑہ میں نظر بند تھے۔ اور لکھنؤ مسلم لیگ و کانگرس کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے۔ آخر کار پہلی دفعہ "جداگانہ انتخاب" کا طریقہ مسلمانوں کی نیابت کا تنہا ذریعہ رہ گیا۔

دوسری خطرناک غلطی اس وقت یہ کی گئی (جس کے لیے اب مسلمان چودہ برس سے رو رہے

ہیں، پنجاب اور بنگال کی مسلم اقلیت کو قلیل اکثریت سے بدل دیا گیا۔ اگر ہمارے دوستوں کی نظر مستقبل پر ہوتی تو پنجاب کو کافی اور بنگال کو ارادی اور کمزور اقلیت نہ بنا دیتے۔ ان ہی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لیے گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس نکتہ پر غلط فہمی کو راہ نہ دیجیے۔ اس نکتہ کو ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور وزیر اعظم پہلے سے خوب سمجھ لیں۔ اسی نکتہ سے مجھے اپنی بحث شروع کرنی چاہیے تھی، لیکن مجھے خوشی ہے کہ زمین کو سنگ بنیاد کے لیے صاف کر دینے کے بعد اب میں اس نکتہ پر پہنچا ہوں۔ اس بحث میں میں زیادہ وقت نہ لوں گا۔ اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر، اُن کو پورے حقوق دیے جائیں اور ایسے صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کے حقوق کو محفوظ کیا جائے اور ہندو قوم کے ساتھ منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی غرض سے ہونا چاہیے کہ یہی عمل ہندو قوم کے ساتھ کیا جائے جس بات کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر قوم کو ہر صوبہ میں جہاں وہ تعداد میں زیادہ ہو پورے حقوق دیے جائیں اور جہاں وہ تعداد میں کم ہو اس کے تحفظ کا انتظام کیا جائے۔ مسلمان جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے اور یہی ہمارے پوائنٹ کا لب لباب ہے۔ حق انتخاب جداگانہ اصل چیز ہے کہ ہر فیڈرل گورنمنٹ ہو تاکہ مرکزی حکومت جہاں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ہو گی ان کو ہر موقعہ پر نہ دبا سکے۔ اور یہ کہ صوبوں کی فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کو ہر جگہ ہندوستانی نائبین کی کل تعداد میں کم از کم ایک تہائی جگہیں دی جائیں۔ نیز یہ کہ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی قلیل اکثریت ہے اور جہاں اس اکثریت پر بنیوں، سکھوں اور ہندو زمینداروں کے اثرات حاوی ہیں، جیسی کہ بنگال میں حالت ہے، یہ اکثریت محفوظ کر دی جائے (ذاتی طور پر اگر صرف آئندہ بیس برس کے لیے ایسا کر دیا جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا) علاوہ بریں سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے، پوری اصلاحات مسلمانوں کو دی جائیں جو اب تک برطانوی فوج، اور سول اقتدار اور نیز ہندوؤں کی قدرتی تنگ نظری کے باعث نہیں دی گئی ہیں۔ اور سندھ کو آسام کی طرح ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح محفوظ ہو جائے

جس طرح ہندوؤں کی اکثریت دیگر صوبوں میں ہوگی۔ اگر نئے دستور کے ماتحت ان چند صوبوں میں مسلم اکثریت قائم نہ کر دی گئی، میں عرض کرتا ہوں دھمکی نہیں دیتا، مگر نہایت ادب سے اور دوستانہ طور پر متنبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہو جائے گی۔ اس حقیقت کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ یہ چار یا پانچ صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کو وہی قوت حاصل ہو جو ہندوؤں کو تمام دوسرے صوبوں میں حاصل ہوگی۔ اور ہندوؤں کا وہی تحفظ کیا جائے جو مسلمان اپنی اقلیت کے لیے مانگتے ہیں۔

پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلم اکثریت صرف بقدر ۶ اور ۵ کے ہے، یہ بالکل ناممکن ہے سکھوں یا یورپین لوگوں کو اُن کی تعداد سے زیادہ کچھ حقوق دیے جا سکیں۔ اور ان کو اس کی ضرورت ہے جیسا کہ میں ابھی واضح کروں گا۔ "ویٹیج" دینے کا تمام منصوبہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ صرف دو صوبوں میں مسلمانوں کی قلیل اکثریت سے اُن کو محروم کر دیا جائے۔ ان دونوں صوبوں میں رائے دینے کا حق چاہے دونوں صوبوں کے لیے مساوی ہو یا نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونا چاہیے۔ رائے دینے کے حق کا سوال کوئی مذہبی یا شرعی مسئلہ تو ہے نہیں جس میں انتہائی سختی برتی جائے (خود کونسل آف اسٹیٹ کے موجودہ حق رائے دہندگی کو دیکھ لیجیے) ہر حال میں مسلمانوں کی جگہیں ۲۰ سال کے لیے اسی آبادی کی نسبت سے محفوظ کر دی جائیں۔ اس لیے کہ وہ ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہیں اور نو دولت سکھوں کے بہت زیادہ زیر اثر ہیں۔ نہرو رپورٹ میں عام طور پر ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دینے کی تجویز محض مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے پیش کی گئی تھی۔ ایک سچے مسلمان سے زیادہ بالغوں کے اس حق کا حامی کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر خوش قسمتی سے بالغ مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ لیکن آئندہ بیس برس تک کم از کم مسلمان عورتیں بالغہ ہو کر بھی ووٹ دینے گھر سے باہر نہ جائیں گی۔ خواہ کتنے اچھے پردہ کے انتظامات کیوں نہ کیے جائیں۔ اور خواہ پردہ نشین افسران ہی ان کی پرچہ اندازی کی نگرانی کیوں نہ کریں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ آریوں اور پنجاب کے ہندو اور سکھوں کے مقابلہ میں مسلمان عورتیں نقصان میں رہیں گی۔ لہٰذا بالغوں کا عام

حق رائے دہندگی اس وقت بالکل ناقابل توجہ ہے۔ پنجاب اور بنگال کے ان دو صوبوں میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف کہ کونسلوں میں ان کی تعداد ۵۲ اور ۵۵ فی صدی ہو۔ کوئی امر قابل توجہ نہیں ہو سکتا۔

سکھوں نے اپنی حکومت کے قلیل زمانہ میں پنجاب میں اس قدر زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور آج تک دیہات کے لوگوں پر اس کا اتنا زیادہ دباؤ ہے کہ ان کو ہرگز کسی مزید تحفظ کی ضرورت نہیں ہے بارہا انھوں نے خود لکھا ہے کہ اگر مسلمان "فرقہ بندی کو چھوڑ کر عام انتخاب کے نتائج پر رضامند رہیں گے۔ ان کے اس بیان کو اگر گمراہ کن جذبات سے پاک کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی طرح تحفظ کی ضرورت ہی ہے اور اس لیے ان کے حقوق سے زیادہ ان کو کچھ دینے کا سوال غیر ضروری اور محض مہاسبھا کی من گھڑت ہے۔

یہی بات بنگال کے اینگلو انڈین اور یورپین لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ محض بنگالی کی کونسل میں چند جگہیں زیادہ یا کم حاصل کر کے وہ تجارت پر اپنے اُس اثر کو قائم نہیں رکھ سکتے جو انھوں نے جان کمپنی کے زمانہ سے حاصل کر دیا ہے۔ ہم کو کسی اور طریقہ پر اُن کے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیے اور میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ گورنر صوبہ کے لیے جو مستقل ہدایات مرتب کی جائیں ان میں یہ لکھ دیا جائے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس کا مقصد یورپین لوگوں سے انتقام لینا ہو، خواہ ہندوستانیوں کے محسوسات ان کے خلاف کچھ ہی ہوں۔ ۵ یا ۶ فی صدی کی زیادتی سے ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ وہ بالکل بے اثر رہے گی۔ البتہ دونوں میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہے گی۔

صوبہ سرحد کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا۔ اس لیے کہ سرحد کمیٹی اس سوال پر غور کر رہی ہے۔ مگر میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کو اُن دونوں کی آبادی سے دُگنا بلکہ تگنا حق نیابت دے دیں تاکہ ہندو اور سکھ یہ محسوس کریں کہ وہ صوبہ اُن ہی کا اپنا صوبہ ہے جس طرح مسلمانوں کا ہے اور یہ کہ حکومت میں ان کو معقول حصّہ ملتا ہے۔ یہی احساس مسلمانوں کے

اندر ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں پیدا کرانے کی ضرورت ہے جہاں مسلم آبادی صرف ۴ فی صدی ہے اور مدراس میں جہاں وہ صرف ۷ فی صدی ہیں۔ یا اڑیسہ میں جہاں علیحدہ صوبہ بننے کے بعد مسلمان تعداد میں بہت کم رہیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے خلاف یا موافق تمام صوبوں میں یکساں جذبات ہیں اور جب کہ پنجاب میں جہاں اس کی قلیل اکثریت ہے مسلمانوں کے جذبات اس قدر تلخ ہیں تو ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں کیا حال ہوگا جہاں اسلامی آبادی بہت قلیل ہے اور جہاں ہندو حکومت مسلمانوں پر قائم ہوگی۔ خطرہ یہ ہے کہ انتقام کا خیال ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں بہت زیادہ ہے جن کو ہندوستان کی غلط تاریخ سیاسی اغراض کے لیے پڑھائی گئی ہے۔

البتہ ہندوستانی ریاستوں میں جہاں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی ہے مگر جہاں والیانِ ریاست کی انسانیت باوجود اپنی کمزوریوں کے بہتر تاریخ بنانے میں مسلمانوں کے حقوق کا زیادہ تحفظ کیا جاتا ہے اور باوجود جمہوریت پسند ہونے کے میں اس حقیقت کو ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

برسبیل تذکرہ مجھے اس حقیقت کا ذکر کر دینا چاہیے کہ اقلیتوں میں مسلمانوں کی ہردلعزیزی ۱۲½ سو برس کی ملک گیری کے بعد کیونکر زیادہ ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ مسلمانوں سے اس لیے ناراض ہیں کہ کسی زمانہ میں انھوں نے ایران کو فتح کر لیا تھا۔ کچھ اس سے ناخوش ہیں کہ انھوں نے برنطیم، شام اور مصر کو تسخیر کیا تھا، اور جنگ صلیبی میں فلسطین کو اپنے قبضہ سے نکلنے نہ دیا۔ بہر حال جس کسی نے بھی ہندوستان پر حکومت کی وہ خواہ مسلمان ہو یا انگریز اس کو اپنی پرانی رعایا کے اصلی یا فرضی شکایتوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا اور یہ امر تعجب انگیز ہے کہ مسلمان اب بھی اپنی رعایا کے محبوب ہیں۔ انگریز خود اپنے خلاف اس جذبۂ انتقام کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور جدید دستور کے بنانے کے لیے انھیں کم از کم ایک عرصہ کے لیے اس جذبۂ انتقام کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اب میں اقلیتوں کے تحفظ کے سوال سے بحث کروں گا۔ ۱۴ شرطوں میں اکثر شرطیں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ہیں۔ مثلاً یہ شرط کہ کونسلوں میں کوئی ایسا قانون جس کے خلاف ہندو یا مسلم اقلیت کے ۳/۴ نائبین اور جس کو یہ ۳/۴ اقلیت اپنے مفاد کے خلاف سمجھے پیش اور منظور نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک تاریخی شرط ہے جو کانگرس نے اس وقت لگائی تھی جب ۱۸۸۷ء میں مسٹر بدرالدین طیب جی نے جو کانگرس میں شریک ہونے والے دوسرے نامور مسلمان تھے، سر سید احمد خاں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ایک ایسی شرط جس کو ہندوستان کے اس پارلیمنٹ (کانگرس) نے جس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی اور جو صرف بحث مباحثہ کر سکتی تھی خوشی سے منظور کیا تھا۔ اب بھی اس پارلیمنٹ کو منظور کرنا چاہیے۔ جب کہ اس کی طاقت تسلیم کی جاتی ہے۔ اور اس کو اختیارات دیے جانے والے ہیں۔ میں تو مصر ہوں کہ اس شرط کے الفاظ کانگرس ہی کے دستور العمل سے نقل کیے جائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ شرط کسی مذہب کے تحفظ کے لیے نہیں ہے بلکہ قومی مفاد کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ مذہب قانون سے بالاتر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اجلاس کانفرنس سے چلا آیا تھا۔ جب وزیر اعظم نے فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ہمیں یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہیے کہ کوئی قانون کسی مذہب یا کسی مذہب کے رسم و رواج کے متعلق نہ پیش کیا جائے گا جب تک گورنر منظوری نہ دے۔ اب بھی اس شرط کی وجہ سے کافی خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ سارداایکٹ کے متعلق پاس نہ ہونے کے بعد بھی گورنر سے اجازت نہیں لی گئی بلکہ منظوری صرف ایک مسودہ قانون کے لیے دی گئی تھی جو ابتداءً پیش کیا گیا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر ہندو یا کسی دوسرے "مائل بہ ترقی" مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے متعلق قانون بنانے چاہیں۔ مگر میرا مذہب تو ایسا "مائل بہ ترقی" نہیں ہے۔ وہ تو خدا کے بنائے ہوئے قانون رکھتا ہے۔ میں نے یہ حقیقت اس بیان میں واضح کر دی تھی جو ۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو علماء اور لیڈروں کے ایک وفد کے ساتھ میں نے ہز ایکسیلنسی وائسرائے کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جس کی ایک نقل میں اس تحریر کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اس قدر اہم معاملات جیسا کہ یہ ہے، عجلت کے ساتھ طے نہ ہونے چاہئیں اور جب پھر

موقع آئے گا تو میں یہ طے کرانے کی کوشش کروں گا کہ کم از کم مسلمانوں کا مذہب انسانوں کی قانون سازی سے بالاتر رکھا جائے چاہے قانون ساز جماعت برطانوی پارلیمنٹ ہو یا ہندوستانی بغیر اس کے کوئی مسلمان کسی دستور اساسی کے ساتھ وفاداری کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

اب میں صرف ایک لفظ "ویٹیج" کے متعلق کہوں گا جو مسلمانوں کو حاصل ہے اور وہ ہر ایسے صوبے میں حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں ان کی اقلیت بہت کمزور ہے۔ کسی صوبہ میں اس "ویٹیج" سے ان کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ شیکسپیئر نے یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ قوت برداشت اس فرقہ کا تمغہ امتیاز ہے۔ مگر "ویٹیج" ہر جگہ مسلمانوں کے وزن میں کسی قدر اضافہ کرتا ہے، اور اس اضافہ کی ضرورت کو مجھ سے زیادہ کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ بیماری کی وجہ سے میری غیر حاضری میں اقلیتوں کی کمیٹی اور دوسری جگہوں پر میری جماعت کی کوئی نمائندگی باقی نہیں رہی۔ "ویٹیج" سے صرف اتنا ہوگا کہ یہ ایسی قوم جس کی نمائندگی اس قدر کم ہو یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ حکومت میں ہمارا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوگا۔ وہی "ویٹیج" جو مسلمان مانگتے ہیں وہ ہندوؤں کو بھی ہر ایسے صوبہ میں دینے کے لیے تیار ہیں جہاں اتنی ہی کم ہندو اقلیت ہو۔ لیکن بنگال یا پنجاب میں جہاں ہندو اقلیت درحقیقت بہت زیادہ منظم اور سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ قوی ہے اور بہت دولت مند اور بہت تعلیم یافتہ ہے، وہاں "ویٹیج" کا مطالبہ بہت لغو ہے یہی بات پنجاب میں سکھوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جو قطع نظر تمام دوسرے مباحث کے معاشرتی حیثیت سے ہندو ہیں۔ اور سیاسی حیثیت سے ہندو قوم کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے ہیں۔ سندھ میں بھی ہندو اقلیت زیادہ منظم، زیادہ دولت مند اور مسلمانوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ باوجودیکہ مسلمان بڑے بڑے زمیندار ہیں پھر بھی ان کو "ویٹیج" دینا چاہتا ہوں۔ اتنا کہ بڑے سے بڑے حریص کی بھوک کو تشفی دے سکے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں اس معنی میں فرقہ پرست ہوں جو معنی فرقہ پرستی کے یورپ میں لیے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ بیس برس پہلے میں انتخاب جداگانہ کی تجویز کے مصنفوں میں سے ایک تھا۔ میں نے

محسوس کیا ہے کہ اب اس کا وقت گزر گیا اور یہ کہ اب ہندوستانی قوم پرستی کے مفاد کی خاطر ہم کو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بر بنائے قومیت قبول کر لینے چاہئیں لیکن انگلستان کی طرح ہم کو مشترکہ حلقۂ انتخاب جو بر بنائے رقبہ ہوں قبول کر لینا محض لغویت ہوگی۔ فرض کیجیے کہ نواب عبدالقیوم یا ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں جہاں اقلیتوں کی تعداد صرف ۴ اور ۷ فی صدی ہے ان کو اپنے صحیح نمائندوں کے انتخاب کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ چاہیے ان کے لیے یہ جگہ کونسل میں محفوظ ہوں۔ اگر ۹۶ فی صدی اور ۹۳ فی صدی اکثریت کے ہاتھ میں اقلیتوں کے نمائندوں کا انتخاب چھوڑ دیا گیا تو محض بے کار اور کمزور اشخاص جو صرف مذہبی مسائل سے مسلمان یا ہندو کہے جاتے ہیں، سیاسی نقطۂ نظر رکھنے والے ہندو مسلمان اکثریت کے ووٹ سے منتخب کیے جائیں گے۔ اس لیے میں نے بہت سے دوستوں سے مشورہ اور گفتگو کرنے کے بعد ایک دوسری تجویز پیدا کی ہے۔ یہ تجویز یقیناً اکثریت کی اس تجویز سے جو سائمن رپورٹ میں پیش کی گئی ہے زیادہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دونوں قوموں کی جگہیں محفوظ کر دی جائیں مگر کوئی امیدوار منتخب نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ :

۱۔ اپنی قوم کے کم از کم ۴۰ فی صدی ووٹ حاصل نہ کر لے۔ اور

۲۔ کم از کم دوسری قوم کے کل ڈالے ہوئے ووٹوں میں سے ۵ فی صدی حاصل نہ کر لے۔ اگر اس کی قوم اس مقام پر دس فی صدی یا اس سے کم ہو۔ لیکن اگر وہ قوم اس سے زیادہ ہو، تو امیدواروں کے لیے ۱۰ فی صدی ووٹ دوسری قوم کے حاصل کرنا ضروری ہوں گے۔ اس طرح تین مقاصد حاصل ہوں گے۔ اوّل تو ہر امیدوار کو دونوں قوموں کے پاس اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر جانا ہوگا۔ جیسا کہ منٹو مارلے المفارم کے وقت ہوتا تھا، مگر اب نہیں ہوتا گویا اس طرح دونوں قوموں کی وہ بے عنوانیاں باقی نہ رہیں گی جو مانٹیگو چلمسفورڈ اسکیم کے باعث ہو گئیں جس نے ہندوستان کے سیاسیات اور معاشرتی زندگی کو بھی تباہ کر دیا۔ دوم یہ کہ کوئی شخص کسی قوم کا نائب منتخب نہ ہوگا جب تک کہ وہ اس قوم کی ایک خاص تعداد کی نیابت نہ کرتا ہو چاہے وہ اکثریت کا نمائندہ نہ ہو جس کا اب جداگانہ انتخاب میں ہوتا ہے۔

تیسرا مقصود بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص جو دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ تعلقات نہ رکھتا ہو گا منتخب نہ ہو سکے گا چاہے وہ خود اپنی قوم کے سب ووٹ حاصل کرلے۔ اس طرح پہلی دفعہ "فرقہ بندی" کا خاتمہ ہو جائے گا اور صحیح "قوم پرستی" پیدا ہو سکے گی۔ یہ تجویز یقیناً دوسرے طریقوں سے بہتر ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کا کوئی امیدوار اس شرط کو پورا نہیں کر سکتا تو پھر وہ شخص منتخب ہو گا جس کے حق میں اسی قوم کے ووٹ آئے ہوں جس کے لیے وہ جگہ محفوظ ہے۔ یہ گویا موجودہ انتخاب جداگانہ کا تصفیہ ہو گا۔ جو بدقسمتی سے ابھی تک ناگزیر ہے۔ میں جداگانہ انتخاب کا اس سے زیادہ حصہ جدید دستور اساسی میں جس کے بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے نہیں چاہتا۔ مگر بغیر ان شرائط کے مسلمان ہرگز مشترکہ انتخاب کو منظور نہ کریں گے۔ جس میں ایک بے کار آدمی یا ایسا آدمی جو خود غرضی کی وجہ سے کسی قوم کے ساتھ مل گیا ہو، اکثریت رکھنے والی قوم کے ۹۶ فی صدی ووٹ سے کامیاب ہو سکتا ہے چاہے خود اس کی تمام قوم اس کے خلاف ہو۔ اس سے زیادہ لغویت اور کوئی ہو سکتی ہے۔ میں اس تحریر کو ہز ایکسیلنسی وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کے سامنے پیش کر چکا ہوں اور وہ اس تجویز کی معقولیت اور جدت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ میں ہوں کہ مجھے اس امر کے ظاہر کرنے کا بھی حق ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سرینواس شاستری بھی اگر زیادہ نہیں تو اسی قدر ضرور متاثر ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ اس بیان کو ختم کرتا ہوں جو وزیر اعظم اور سر جوفری کاربٹ کی مہربانی سے میں باوجود ڈاکٹروں کی مخالفت کے لکھ چکا ہوں۔ میرے ڈاکٹر میری اس نافرمانی سے بہت آزردہ ہوئے ہیں۔ لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میں ان کی مزید نافرمانی کرتا اور خود کانفرنس میں جا کر کمیٹی کے سامنے اس معاملہ کو رکھتا۔ چاہے میں اس کام میں مر ہی جاتا۔ میں وزیر اعظم اور کمیٹی سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اس طویل تحریر کو نظر انداز نہ فرمائیں اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور کریں۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میری یہ تحریر لاکھوں مسلمانوں کی رائے کا آئینہ ہے جن کی آواز گول میز کانفرنس میں نہ سنی جائے لیکن جن کے محسوسات کو ہندوستان کے حکام نظر انداز نہیں کر سکتے جیسا کہ خود سر جوفری کاربٹ جو تمام وقت میرے پاس رہے ہیں بخوبی جانتے ہیں۔

میں ہوں آپ کا اطاعت مند: محمد علی